

(قسط ۷)

افراء اور اُس کی تفسیر معانی القرآن

احمد خان فیلو ادارہ تحقیقات اسلامی

افراء کی افادی زندگی

سیبویہ کے کسائی کے ساتھ مناظرے کے بعد بھی افراء کچھ عرصہ تک اپنے اُستاد کے ہاں مقیم رہا۔ بعد میں وہ کسائی کے ایک رفیق کی حیثیت سے الگ منفرد زندگی بسر کرنے لگا۔ اب وہ ایک مکمل عالم بن چکا تھا۔ اور اسی طرح بدوی قبائل اور فصحاء عرب سے ملاقات نے اس کے ذوقِ زبان و ادب کو کافی حد تک مکمل کر دیا تھا۔ چنانچہ اب وقت آگیا تھا کہ لوگ اس سے بھی باتا عہدہ تلمذ کریں۔ اس کے گرد ایک حلقہ معتقدین جمع ہو گیا جو اس سے نحو، لغت اور قرآن کی تعلیم حاصل کرتا تھا۔

افراء جب کسائی کے حلقہ تلامذہ داخل تھا تو اُس وقت ہی لوگوں نے اس سے استفادہ شروع کر دیا تھا۔ اسحاق بن ابراہیم الموصلی کہتے ہیں کہ میں منہ اندھ سے اُٹھتا ہُشیم سے حدیث سنتا، پھر کسائی کے پاس تھوڑا سا قرآن پڑھتا۔ اور بالآخر قرآن (غالباً تفسیر) کا کچھ حصہ افراء سے جاکر پڑھا کرتا تھا۔ (ادب ۱۹۸/۳)۔ بعد میں افراء نے اپنے اُستاد کی طرح اپنا ایک حلقہ درس قائم کر لیا۔ اس حلقہ میں کئی قسم کے علوم کا درس ہوتا تھا۔ جن میں علوم القرآن، حدیث، فقہ، نحو اور وادین عرب کی تعلیم شامل تھی۔ اور یہ درس عموماً مسجد میں ہوتے تھے۔ انہی مجالس کے دوران کئی لوگوں کی افراء سے ملاقات ہوئی جو اس کے طریق تدریس پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔

دربارِ خلافت سے وابستگی

افراء ہارون الرشید کے عہد میں دربارِ خلافت میں باریابی حاصل کر چکا تھا۔ دربار میں اُس کی حاضری کی ایک مجلس کا ذکر کرتے ہوئے قطرب لکھتا ہے: "افراء ہارون الرشید کے دربار میں حاضر ہوا۔ اور جب اُس نے گفتگو کی تو اُس میں لمحن تھا۔ جعفر بن یحییٰ برمکی نے ہارون سے کہا کہ یہ لمحن کرتا ہے۔ ہارون

نے فرار سے پوچھا تو اُس نے کہا کہ بدوؤں کے ہاں اعراب ہے لحن نہیں، اہل شہر لحن کرتے ہیں۔ جب میں احتیاط سے بولتا ہوں تو لحن نہیں کرتا۔ لیکن جب اپنی اصل طبیعت کی طرف لوٹتا ہوں تو لحن کرتا ہوں۔ (روایات الاعیان ۲۲۵/۵)۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب فرار بدوی قبائل میں پھر پھر اکرا اور صحتِ زبان میں کامیبت پیدا کر کے واپس آیا تھا۔ اس تبحرِ علمی کے سبب فرار کو دربار میں بار مل گیا۔ اگرچہ ہارن الرشید کے ساتھ اُس کی کسی اور مجلس کا تذکرہ نہیں ملتا مگر قیاس کہتا ہے کہ وہ دربار میں وقتاً فوقتاً ضرور جاتا ہوگا کیونکہ اگر کوئی شخص خلفاء کے ہاں شرفِ باریابی حاصل کر لیتا تھا تو اُسے اس وقت تک دربار سے نکالا نہ جاتا تھا جب تک کہ اس سے کوئی ناخوشگوار فعل سرزد نہ ہو۔ چنانچہ اس بنا پر اندازہ یہ ہے کہ فرار رشید کی وفات (۱۹۳ھ) تک دربارِ خلافت سے متعلق رہا۔ ہارن الرشید کے جانشین الامین کے ساتھ اُس کی کسی ملاقات کا تذکرہ نہیں ملتا (معانی القرآن ۱/۹)۔ ممکن ہے فرار اس عہد میں بھی دربار سے منسلک رہا ہو مگر شاید اس دوران کوئی اہم کام اُس نے سرانجام نہ دیا ہو۔ اس لئے اس کا ذکر نہ آسکا۔ یا یہ دور چونکہ فتنہ و فساد کا دور تھا۔ اور اس میں امین اور مامون کی باہمی جھڑپیں زوروں پر تھیں اس لئے فرار نے کسی سے منسلک ہونا خلافِ مصلحت سمجھا ہو۔ مگر جب اس فتنہ کے بعد مامون کامیاب ہو گیا تو فرار اس کے قریب ہو گیا۔

سب کو معلوم ہے کہ مامون کے دربار میں معتزلیں کو قرب حاصل تھا اور گو فرار نے علمِ کلام کا حصول تو کیا تھا مگر اس پر اعتزال کا پورا رنگ نہیں چڑھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مامون کے ہاں جانے میں وہ بیچکچا ہٹ محسوس کرتا تھا۔ اس دوران اس نے ثمامہ بن الاثرس سے ملاقاتیں شروع کر دیں۔ اور ان کے دوران اپنے علم کی دھاک بٹھا دی۔ پھر ثمامہ نے مامون کے ہاں فرار کے تبحرِ علمی کا تذکرہ کیا۔ اس نے فوراً فرار کو اپنے ہاں بلایا۔ اس طرح فرار دربارِ شاہی میں پھر داخل ہو گیا۔ اور مامون کے دونوں بیٹوں کا اتالیق مقرر ہوا۔ اس مشہور واقعہ سے سب باخبر ہیں جس میں فرار کے جوتے لانے کے لئے دونوں شاہزائے آپس میں جھگڑ پڑے تھے۔ اس بات کی خبر مامون کو ہوئی تو اس نے فرار کو دربار میں بلا بھیجا۔ اور اس سے پوچھا کہ لوگوں میں سب سے مکرم کون ہے؟ فرار نے جواب دیا: امیر المومنین۔ اس پر مامون نے کہا کہ وہ شخص زیادہ مکرم ہے جس کے جوتے پیش کرنے کے لئے دو دلی عہد آپس میں جھگڑ پڑتے ہیں۔ (نزہۃ اللباب: ۱۳۰)۔ مامون نے فرار کو اس موقع پر دس ہزار دینار بطور انعام دیئے۔ (البدایۃ والنہایۃ: ۱۰/۲۶۱)۔

اس کے بعد مامون کی نظر میں فرار کا وقار اور بھی بلند ہو گیا۔ اس نے فرار کو نحو کے اصول مرتب

کرنے اور جو کچھ اس نے اعراب سے سن رکھا تھا، جمع کرنے کے لئے کہا۔ اس کے لئے ہر قسم کی آسائش مہیا کی۔ اور اس کے ساتھ کئی کاتب لگا دیئے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب لکھنے میں مشغول ہو گیا۔ وہ اس تالیف میں، جس کا نام کتاب الحدود تھا، اس قدر محو ہوا کہ اسے نماز اور کھانے کے اوقات سے باندیاں مطلع کیا کرتی تھیں، جب یہ کتاب تیار ہوئی تو مامون نے اسے دوسری لائبریریوں کے لئے بھی لکھوا لیا۔ (نہ ہتہ الالباء، ۱۲۸)۔

ابن الندیم نے کتاب الحدود کی تالیف کی وجہ بالکل دوسری بیان کی ہے۔ کہتا ہے کہ کسائی کے شاگردوں میں سے کچھ لوگ فرار کے پاس پہنچے اور اس سے خواہش ظاہر کی کہ وہ انہیں نحو کے شواہد لکھوائے۔ فرار نے ان کی اس درخواست کو مان لیا۔ یہ سلسلہ ابھی چند مجالس تک چلا تھا کہ ایک مجلس میں یہ لوگ کھسک پڑے کہ انہیں لگے کہ اگر یہ شخص اسی طرح ہمیں، بچوں کی طرح تعلیم دیتا رہا تو ہم سے برداشت نہیں ہوگا۔ اس پر فرار کو غصہ آگیا۔ اس نے کہا کہ: اُنھوں نے مجھے اس کام کے لئے تیار کیا۔ جب میں راضی ہوا تو یہ تنگ آ گئے۔ خدا کی قسم۔ اب میں نحو کے بارے میں سب کچھ جمع کر دوں گا۔ چنانچہ وہ سولہ سال تک یہ کتاب الحدود لکھواتا رہا۔ (الفہرست، ۹۹)۔ پھر ابن الندیم نے اس کتاب کے مشتملات کی تفصیل دی ہے، افسوس ہے کہ یہ کتاب دست برد زمانہ کی نذر ہو گئی۔

فرار کا مذہب

جس عہد میں فرار نے آنکھیں کھولیں، اُس میں علم کلام ترقی کر کے باقاعدہ ایک علم کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ چنانچہ فرار بھی علم کلام کے اثرات سے نہ بچ سکا، وہ اپنی تصانیف میں فلسفیانہ خیالات کا نہ صرف اظہار کرتا بلکہ فلاسفہ کی اصطلاحات بھی استعمال کرتا (الفہرست، ۹۹، ادباء، ۷/۲۷۷)۔

اس کے اعتزالی رنگ کا اظہار اس کی تفسیر معانی القرآن سے بھی ہوتا ہے، اس کی طرف انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (طبع جدید) میں مقالہ نگار نے اشارہ کیا ہے۔ مگر خیال ہے کہ اس وقت معتزلہ کے کچھ معتقدات اس قدر عام ہو گئے تھے کہ ہر شخص ان کا قائل تھا، چاہے وہ معتزلی ہو یا غیر معتزلی۔ بعد کے ادوار میں جب معتزلہ پر باقاعدہ لکھا جانے لگا تو ان خیالات کے کسی حصہ کے حامل کو معتزلہ کہہ دیا گیا۔ خواہ وہ شخص اپنے وقت میں اعتزال سے بیزار ہی تھا۔ یہی معاملہ فرار کے ساتھ بھی ہوا۔ بلاشبہ اس نے مامون کے عہد میں زندگی بسر کی۔ کئی مرتبہ دربار خلافت میں حاضری بھی دی۔ مگر اس سارے عرصہ میں کبھی معتزلی معتقدات پر نہ تو اُس کا مذاکرہ ہوا اور نہ بحث۔

جا حظ جو معتزلہ کا بہت بڑا ستون تھا، آخری عمر میں بغداد آیا۔ زبان و ادب کے ماہر اور اعتزالی خیالات کے حامی ہونے کی وجہ سے لوگ اس پر پردہ دار ٹوٹ پڑے۔ اس کے ارد گرد شائقین علم کا جھگڑا لگ گیا۔ وہ انھیں زبان و ادب کے علاوہ معتزلہ معتقدات کا درس بھی دیتا تھا۔ اس سے بہت سے لوگ متاثر ہوئے۔ چنانچہ فراہ بھی جو ہمیشہ طلب علم میں کوشاں رہتا تھا، اس کے ہاں پہنچا اور اس کی اس طرح تعظیم و منزلت کرنے لگا جس کا کہ جا حظ مستحق تھا۔ فراہ جا حظ سے بے حد محبت کرتا تھا، مگر اس کے اعتقادات سے فراہ کو سخت نفرت تھی۔ جا حظ نے دیکھا کہ فراہ بہت ہی ذہین شخص ہے۔ اسے اعتزال کے رنگ میں رنگنا چاہئے چنانچہ جا حظ نے بہتری کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا، دیکھتے کس حسرت سے کہتا ہے: جب مامون ۲۰۲ کو بغداد آیا تو میں بھی وہاں حاضر ہوا۔ فراہ مجھ سے محبت کرتا تھا، اور میں چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے علم کلام پڑھنے، لیکن اُس کا ادھر میلان نہ تھا۔ (وفیات ۲۲۸/۵)

احمد بن یحییٰ بن المرتضیٰ نے معتزلہ کے طبقات پر ایک جامع کتاب لکھی ہے۔ فراہ کے دور کے معتزلہ کو اس نے طبقہ سابع میں رکھا ہے۔ جن میں سے مشہور شامہ بن الاثرس، جا حظ اور علی بن صبیح وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر ان کے ضمن میں بھی فراہ کا ذکر نہیں آیا۔

معانی القرآن کے اندر جن چند مقامات کا اشارہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (طبع جدید) کے مقالہ نگار نے مقالہ بعنوان فساد میں کیا ہے، اس کے بارے میں واضح ہونا چاہیے کہ معانی القرآن اُس کے آخری ایام کی تصنیف نہیں ہے۔ بلکہ وہ اُس کی پتالیس سے پچپن سال کی عمر کے درمیان کا حاصل ہے۔ مگر اعتزال سے سخت بے زاری پچپن سال کے بعد ہوئی ہے۔ معتزلہ کا قول ہے کہ اس آیت (الرحمن علی العرش استوی) میں استوی کی قرأت صحیح ہے۔ ثعلب نے لکھا ہے کہ استوی کے بارے میں دو اقوال ہیں۔ ایک "استوی" جو عام ہے۔ اور دوسرا استوی جو معتزلہ کا قول ہے۔ (مجالس ثعلب: ۳۶۹)۔ مگر لسان العرب میں ہے کہ فراہ نے ان دونوں خیالات کے علاوہ ایک تیسری شکل بتائی ہے اور وہ ہے: اُمہ تقول کامد مقبل علی نلالہ شم استوی علی دالٰی یشا تمسی علی معنی اُقبل اِلٰی دعلی (حاشیہ مجالس ثعلب: ۳۶۹)۔

مندرجہ بالا وجوہ کے بعد جو شخص فراہ کو اعتزال کی طرف مائل کہتا ہے، وہ صرف اس کی زندگی کے ناچختہ ایام پر فیصلہ دے رہا ہے اور فراہ کی زندگی کے آخری ایام سے ناواقف ہے یا کم از کم اس تک صحیح طور پر پہنچ نہیں سکا ہے۔

فراء ایک نحوی و لغوی

”اگر اہل بغداد کو کسائی اور فراء کے علاوہ اور کوئی عالم میسر نہ آتا تو ان کے لئے یہی دونوں تمام دنیا پر افتخار کے لئے کافی تھے۔“ (نزهت الالباء: ۱۳۴، تہذیب التہذیب: ۱۱/۲۱۲)۔ نحو کے مکتب کوفہ کی بنیاد کسائی نے رکھی ہے۔ اس نے اس کے لئے ابتدائی مواد جمع کیا اور فراء نے اس مواد سے اس کی نہ صرف تکمیل کی بلکہ اُسے ایک مکتب نحو کی حیثیت سے امتیازی شان بخشی۔ اور اس مواد کو جدید علمی منہج پر ترتیب دے کر اس میں جان پیدا کر دی۔ (مدرسہ الکوفہ: ۱۲۷)۔ فراء کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ امیر المومنین فی النخو تھے (تہذیب التہذیب: ۱۱/۲۱۲)۔

اہل کوفہ کہا کرتے تھے، لنا ثلاثة فقهاء في نسق لم ير الناس مثلهم: أبو حنيفة، البراء، والبراء بن محمد بن الحسن، ولنا ثلاثة نحويين كذلك وهم أبو الحسن علي بن حمزة، الكسائي وأبو زرعة يحيى بن زياد الشراء وأبو العباس أحمد بن يحيى الثعلبي (ادباء: ۱۵۲/۲)۔

سیوطی کا قول ہے کہ: أما علماء الكوفيين بعد الكسائي فأعلمهم بالنحو الفراء (المزهر: ۲/۴۱۰) جس طرح بصری مکتب نحو کے بانی خلیل تھے، اسی طرح ہی کوئی مکتب نحو کے ابو جعفر الرواسی، بصرہ کے سیبویہ کے مقابل میں کوفہ کے کسائی اور فراء تھے۔ (مدرسہ الکوفہ: ۶۷)۔ نحو کے مکتب کوفہ میں فراء نے جو مقام حاصل کیا ہے، اس کے بارے میں الخزومی نے اپنی کتاب ”مدرسہ الکوفہ فی النخو“ میں نہ صرف ایک مستقل باب باندھا ہے بلکہ کتاب کے تقریباً ہر صفحے پر فراء کے احسانات گنائے ہیں۔

فراء نے الکسائی کی تتبع میں نحو کے مکتب کوفہ کی بیش قیمت خدمت کی ہے مگر اس سے ہرگز یہ مطلب نہ لیا جائے کہ فراء سو فی صدی اس کا پیرو تھا بلکہ کئی مسائل میں اس نے الکسائی سے اختلاف کیا ہے۔ اور اس سے الگ اپنا مسلک پوری طرح واضح کیا ہے۔ (مراتب النحویین: ۸۸)۔

الغرض فراء نے عربی لغت اور علم النخو کی ایسی خدمت کی ہے جو رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔

متفرقات

سلمۃ کہتے ہیں کہ فراء نے اپنی عمر میں کبھی کوئی شعر نہیں کہا۔ (طبقات النحویین: ۱۴۰) مگر اس کے باوجود کئی اشعار مذکور ہیں جو فراء کی طرف منسوب کئے گئے ہیں، یہ اشعار ابن خلدکان نے ذکر کئے ہیں۔ (وفیات: ۲۲۸/۵)۔ فراء تعلیم و تدریس کے علاوہ باقی اوقات میں کبھی گھر نہیں بیٹھتا تھا، وہ کسب معاش کے لئے گھومتا رہتا۔ جو کچھ اس طرح سال میں جمع کرتا، وہ سال کے آخری ایام میں کوفہ لے جاتا اور چالیس یوم تک اپنے گھر میں رہ کر

اہل وعیال میں جمع شدہ رقم تقسیم کر دیتا۔ (وفیات الاعیان ۲۲۸/۵)

تعلیم کے دوران اس کا دھیرہ یہ تھا کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ شیوخ کے ہاں طلب علم کے لئے جاتا مگر اس کے پاس کسی قسم کا کوئی کاغذ یا کتاب نہیں ہوتی تھی۔ یعنی سب کچھ حفظ کرتا تھا۔ اور جب کہیں کوئی اہم چیز جو حدیث یا تفسیر سے متعلق ہوتی، دورانِ درس آجاتی تو اپنے اُستاد سے گزارش کرتا کہ اسے دوبارہ فرمائیے گا۔ اور اس طرح اسے حفظ کر لیتا۔ (تاریخ بغداد: ۱۴/۱۵۲)

فراء کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ اس نے تقریباً اپنی تمام تصانیف کی املا اپنے حافظہ سے کرائی ہے۔ یہ تصانیف تین ہزار اوراق پر مشتمل تھیں۔ پچاس اوراق پر مشتمل دو کتابیں لکھواتے وقت صرف چند اوراق اس کے پاس دیکھے گئے۔ (نزهتہ الالباء: ۱۳۵)

کسی بات کو سمجھانے کے لئے ہمیشہ اندر حد کوشش کرتا تھا مگر جب شاگرد کو ٹی بات سمجھ نہ پاتا تھا تو اس پر کبھی ناراض نہ ہوتا بلکہ اسے اپنی ہی کمزوری گردانتا۔

فراء کے اقوال میں سے ایک یہ ہے: ارحم رجلین، فرجل یقہم دلا یطلب ورجل یطلب دلا یفہم۔ (مجالس ثعلب: ۱۵۹)

فراء کبھی اپنی خود ستائی نہ کرتا تھا اور نہ مدح کو پسند کرتا تھا۔ ایک مرتبہ فراء سعید بن مسلم کے پاس گیا تو اس نے کہا کہ: قد جادکم سید اهل اللغة وسید اهل العربیۃ۔ تو فراء نے فوراً ٹوٹا اور کہا کہ جب تک ہم میں انخس موجود ہے، اس وقت تک اس خطاب کا کوئی اور مستحق نہیں۔ (ادبائے ۲۴۳/۳)

معانی القرآن

رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد ہر مسلمان کی خواہش ہوتی تھی کہ قرآن و حدیث کے بارے میں جو کچھ علم میرے سینے میں موجود ہے، وہ دوسرے تک پہنچ جائے۔ اسی طرح ہر مسلمان یہ کوشش کرتا تھا کہ جہاں کہیں سے کچھ علم کی بات میسر آجائے اسے اپنے ہاں محفوظ کر لے۔ چنانچہ یہ طریقہ اسلام کی ابتدائی دو ڈھائی صدیوں تک چلتا رہا، لوگ ادھر ادھر طلب علم کی غرض سے سفر کیا کرتے۔ اگر کہیں دُور فاصلے پر کسی شخص کے ہاں کسی علمی بات کا پتہ چلتا تو میلوں سفر کر کے اس تک پہنچ جاتا۔ اس دور میں علم سینوں میں محفوظ چلا آتا تھا۔ کہیں کہیں علماء حضرات اس علم کو مدون بھی کر دیتے تھے مگر ترجیح اسی علم کو دی جاتی تھی، جو روایت دوسرے سے ملتا تھا۔ قرآنی علوم کو بھی اسی ہیج پر مدون کیا گیا۔ تفسیر کے

اس طریقے کو روایتی تفسیر کہتے ہیں۔ اس طریق تفسیر میں مفسر کے سامنے وہ روایات ہوتی تھیں، جو اس وقت تک صحابہ، تابعین اور تبع تابعین میں سینہ بہ سینہ چلی آتی تھیں۔ ان روایات میں معتد بہ حصہ احادیث کا بھی ہوتا تھا۔

تاریخ اسلام کی ابتدا ہی سے تفسیر کا یہ ڈھنگ پڑ گیا تھا کہ مفسر ایک ایک سورت کو علی الترتیب لیتا اور آیت کے ایک ٹکڑے یا ساری آیت یا چند آیات کے مجموعے پر بٹھ کر اس کا مطلب بیان کرتا۔ اسی طرح وہ اپنی شخصیت اُس تفسیر میں نمایاں کر دیتا تھا۔ اس قسم کی ترتیب دار آیات کی تفسیر سب سے پہلے کس نے کی، اس کے بارے میں دو ٹوک بات کہنا بہت دشوار ہے۔

احمد امین دہلوی الاسلام ۱۳۱/۲ کا میلان اس طرف ہے کہ فراء ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے اس انداز کی تفسیر کا ڈھنگ ابتکار کیا تھا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس سے قبل لکھی جانے والی مطبوعہ تفسیر مجاز القرآن از ابو عبیدہ عمر المثنیٰ کا بھی بالکل یہی انداز ہے۔ اس لئے فراء کے بارے میں یہ فیصلہ کہ وہی اس انداز کا خالق ہے، بے جا نظر آتا ہے۔

فراء سے قبل بہت سی تفاسیر لکھی جا چکی تھیں حتیٰ کہ سعید بن سعدۃ الاخفش اور یونس بن حبیب بصری کو جو فراء کے استاد تھے معانی القرآن کے نام سے ہی تفسیر لکھنے کا شرف حاصل ہو چکا تھا۔ یونس ابن حبیب نے اس نام کی دو تفسیریں لکھی تھیں، جو معانی القرآن صغیر اور دوسری معانی القرآن کبیر کے نام سے موسوم تھیں۔ کسائی نے بھی ایک تفسیر لکھی تھی، جس کا نام معانی القرآن تھا۔ ابو جعفر الراسی نے بھی اسی نام کی ایک تفسیر لکھی تھی اور ان سے کافی عرصہ قبل مورج السدوسی نے بھی بالکل اسی نام کی ایک تفسیر لکھی۔ ایک روایت کے مطابق فراء نے انہی کے انداز پر یہ تفسیر لکھی تھی۔ (طبقات النخوعین، ۲۳۴)۔ مگر اپنی تفسیر میں فراء نے جن مسائل کی بھرمار کی ہے، اس قسم کی تفسیروں میں اس کا پہلا نمبر ہے۔ فراء نے ویسے تو تین لے کے قریب کتابیں لکھی ہیں مگر تفسیر کے میدان میں معانی القرآن کے علاوہ المصاڈنی القرآن

لہ ان کتب کا تذکرہ آپ معانی القرآن کے مقدمہ کے علاوہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالہ "فراء" میں بھی دیکھ سکتے ہیں مگر دو ایسی کتابیں ہیں جن کا تذکرہ ان کے ہاں نہ مل سکے گا وہ ہیں عدوای القرآن (دیکھئے فہرست مخطوطات چٹربٹی نمبر ۸۸، ۸۹) جو فراء کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ اور دوسری ہے کتاب الادغام۔ (دیکھئے نزہۃ الالباد، ۷۰، ۷۱)

الجمع والتثنية في القرآن، عدد آي القرآن اور الشکل البکیر و الشکل الصغیر کے نام سے مختلف اوقات میں کتب و رسائل مدون کئے ہیں۔ اور تقریباً سبھی کی املا کرائی ہے۔

فراء کی بچی ہوئی چند کتب میں سے معانی القرآن بہت اہم کتاب ہے۔ قرآن کریم کی یہ تفسیر فراء نے اپنے شاگردوں کو لکھوائی تھی۔ اس کی املا کے دوران کسی کتاب سے مدد نہیں لی گئی۔ اور نہ ہی لکھواتے وقت فراء کے ہاتھ میں کوئی کتاب دیکھی گئی۔ سب کچھ اس نے زبانی لکھوایا ہے۔

معانی القرآن کی تالیف کا ایک سبب ابن عماد الحنبلی نے یہ بتایا ہے کہ ”فراء نے یہ کتاب المامون کی خواہش پر لکھی تھی۔“ مگر یہ سبب کسی طرح درست نظر نہیں آتا۔ اس لئے کہ مامون سے فراء کے تعلقاً ۲۰۴ھ کے بعد قائم ہوئے۔ اور محمد بن الجہم کی شہادت کے مطابق تفسیر کی املا ۲۰۲ھ سے شروع ہو چکی تھی۔ اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ مامون کی ملاقات سے پہلے ہی فراء نے معانی القرآن کی املا اس کی خواہش کے مطابق شروع کر دی ہو۔

اس ضرورت کے محسوس کرنے کے بعد جس کا ذکر عربین بکیر نے کیا تھا، فراء نے اپنے اصحاب کو جمع کیا اور قرآن کے مطالب کی املا کے لئے خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ لوگ تیار ہو گئے۔ ان مطالب کے لکھوانے کے لئے ہفتے میں خاص دن مقرر کئے گئے۔ ان مقررہ ایام میں وہ سب جمع ہوتے اور فراء باقاعدہ تیار ہو کر سر پر ایک بڑی ٹوپی پہن کر ان کو مسجد میں معانی القرآن لکھواتا۔ ایک شخص سے قرآن پڑھنے کے لئے کہا جاتا۔ پھر چند آیات کے بعد فراء اُسے ٹھہرنے کا حکم دیتا۔ تب وہ اس حصے کی نحوی و لغوی اور علم قرأت کی رو سے تشریح کرتا اور اس کے بعد دوسری آیت لے لیتا۔ اسی طرح معانی القرآن کو مکمل کیا گیا۔ (تاریخ بغداد ۱۴/۱۵۳، طبقات النحویین ۱۴۰)

معانی القرآن کے چار اجزاء تھے (الفہرست ۹۹) اور سب اجزاء کا مجموعہ ایک ہزار اوراق تک پہنچتا تھا (طبقات النحویین ۱۴۳-۱۴۶، وفيات الاعیان ۵/۲۲۶)۔ اس تفسیر کی املا کے لئے بے شمار لوگ جمع ہوتے تھے (نزهة اللباب: ۱۲۸) جن میں سے نوے کے قریب تو قاضی ہی ہوتے تھے (شذرات الذهب ۲/۱۹)۔ ابن خلدون کا بیان ہے کہ لم یعمل مثله ولا یکنی لاحد ان یزید علیہ (وفیات الاعیان ۵/۲۲۶) کہتے ہیں کہ جب معانی القرآن تیار ہوئی تو اس متاع بے بہا کو لوگوں نے عام کرنے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ جب تک لوگ پانچ اوراق کے عوض ایک دینار نہ دیں گے اس وقت تک اس

تفسیر کے اور نسخے تیار نہیں کئے جائیں گے۔ لوگوں کے اس میلانِ طبع کا علم جب فراء کو ہوا تو اس نے سب کو بلا کر اس بخل سے باز رہنے کا حکم دیا مگر وہ نہ مانے۔ تب فراء نے غصہ کی حالت میں ایک دوسرے شخص کو مسجد میں بلایا اور خواہش مند حضرات کو تفسیر لکھولے کی دعوت دی۔ پہلے دن ہی فراء نے ”بسم اللہ“ کی تشریح میں تقریباً ایک سو صفحات لکھوا ڈالے۔ اس واقعہ کی خبر جب پہلے کاتبین کو ہوئی تو اس خوف سے کہ پہلی تفسیر کی وقعت کم نہ ہو جائے وہ ضرورت مند حضرات کے لئے ایک دینار کے عوض دس اوراق لکھ کر دینے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ (تاریخ بغداد: ۱۵۰/۱۴)

فراء کی نحوی، لغوی اور دیگر قسم کی کتب کے مطالعہ کے بعد ان تین چیزوں کا پتہ چلتا ہے جو فراء کے ذہن کی اجزائے ترکیبی کہلانے کی مستحق ہیں۔

- ۱۔ قرآن کریم: ایک دینی کتاب ہونے کے علاوہ فراء قرآن کی زبان و ادب سے بے حد متاثر تھے۔ وہ قرآن کے اعجاز لغوی کے پورے پورے قائل تھے۔ وہ اس خیال کے تھے کہ قرآن قریش کی زبان میں اُترا ہے جو مکروہ قسم کے لہجہات سے پاک تھی۔ تفسیر کے دوران ایک بات کی تائید میں جس قدر دوسری آیات کو فراء نے پیش کیا ہے اس قدر کسی مفسر کے ہاں اتنی وافر تعداد میں شواہد قرآنی موجود نہیں ہیں۔
- ۲۔ مختلف مقامات: جس عہد میں فراء نے آنکھ کھولی، وہ قراءات کا عہد تھا۔ قرآن کے نزول پر صرف ڈیڑھ صدی گزری تھی۔ قراءات کے مختلف مکاتب اپنی اپنی خصوصیات کے ساتھ امتیازی شکل اختیار کر چکے تھے۔ مشہور قراء کے علاوہ چھوٹے چھوٹے بیسیوں قاری اپنا مقام پیدا کر چکے تھے۔ ابتدائیں مدینہ، کوفہ، بصرہ اور بعد میں بغداد ان قراء حضرات کا مرکز تھا۔ فراء کے جید اساتذہ میں سے الکسائی بذاتِ خود ایک ممتاز قاری تھے۔ یہ قراء حضرات نہ صرف قراءات کے مختلف طریقوں کی تعلیم دیتے تھے بلکہ اپنی پسندیدہ قراءات کے ثبوت کے لئے عقلی و نقلی دلائل بھی بہم پہنچاتے تھے۔ الغرض فراء کے چاروں طرف قراءات کا ایک جنم کھلا ہوا تھا۔ فراء نے بھی اس باغ سے اپنے حصہ کے پھول چن لئے۔ فراء نے جن قراءتوں کو لیا معانی القرآن میں جگہ دے کر ان کو حیاتِ جاودانی بخش دی۔

- ۳۔ کلام عرب: جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، فراء بدوی قبائل میں صحتِ زبان کے علم کی خاطر کئی سال بھرتا رہا۔ اس دوران اس نے کئی قبائل کے نشری و شعری ادب کو حفظ کیا، یہی ادب آئندہ چل کر اُسے قرآن کی تفسیر میں اور دیگر کتب میں مدد و معاون نظر آیا۔ وہ اپنی بات کی تائید میں مختلف قبائل کے کلام کو

پیش کرتا ہے۔ اسی طرح مختلف لہجات کا ذکر کر کے ان کے اختلاف کو بھی واضح کرتا ہے۔ قرار کی کئی آراء کی بنیاد ہی یہ کلام عرب ہے۔ اس ادب میں تحریری و زبانی دونوں قسم کا ادب شامل ہے۔

یہی تینوں چیزیں "معانی القرآن" کی واضح خصوصیات ہیں۔ قرار کا طرز تفسیر یہ ہے کہ ایک یا چند آیات کے ان میں جس قدر قرارات کا اختلاف موجود ہے، انہیں ان کے قرار کی طرف منسوب کر کے بیان کرتا ہے، پھر ہر ایک کی قرارۃ کے الگ الگ وجوہ پیش کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اگر کوئی لغوی بحث کی ضرورت پیش آتی ہے تو اُسے بھی ذکر کرتا ہے۔ اور اپنے اقوال کی تائید میں قرآن، حدیث، اقوال عرب اور شعراء کے اشعار پیش کرتا جاتا ہے۔ قرآن کے اندر جو غریب الفاظ آئے ہیں، ان کی تشریح بھی مندرجہ بالا انداز پر کرتا ہے چونکہ یہ وہ دور ہے جس میں انہی تینوں چیزوں کا زور تھا اس لئے تمام تفسیر میں عقلیت خال خال ہی نظر آتی ہے۔ قرار روایت لفظی کی طرف بہت دھیان دیتا تھا۔ (مدرسہ الکوفہ، ۱۷۱)

معانی القرآن کی طباعت

سن ۱۹۵۵ء کے اوائل میں احمد یوسف النجاشی اور محمد علی النجار کو جو فقہ، تفسیر اور عربی زبان و ادب پر کامل عبور رکھتے تھے، اس کار جلیل کے لئے تیار کیا گیا۔ مگر ان سے قبل جناب محمد صغیر حسن المعصومی جو اس وقت ڈھاکہ میں ریسرچ سکالر تھے قرار کی اس تفسیر پر کام شروع کر چکے تھے۔ اس سلسلہ میں پروفیسر احمد امین مرحوم سے خط و کتابت بھی ہوئی تھی۔ بلکہ انہی کے ایما پر کام شروع کیا گیا معصومی صاحب ڈیڑھ سال تک اس پر کام کرتے رہے۔ آپ کے پیش نظر نور عثمانیہ اور علامہ محمود شنفی کے نسخے تھے۔ مگر کام ابھی ابتدائی مراحل میں ہی تھا کہ قاہرہ سے معانی القرآن کی پہلی جلد چھپ کر آگئی۔ تو انھوں نے اس کام کو ترک کر دیا۔

ابھی تک اس تفسیر کی دو جلدیں طبع ہوئی ہیں تیسری جلد میں ایک تفصیلی انڈیکس بھی ہو گا۔ پہلی جلد جو فروری ۱۹۵۶ء میں دارالکتب المصریہ سے چھپ کر تیار ہوئی، وہ ابتدائے قرآن سے سورۃ یونس تک کی تفسیر ہے، اس کے دس سال بعد دوسری جلد ۱۹۶۶ء میں الدار المصریہ للتالیف والترجمہ قاہرہ سے چھپی جو سورۃ ہود سے سورۃ الزمر تک کے حصے کی تفسیر ہے۔ پہلی جلد نہایت اہتمام کے ساتھ عمدہ ٹائپ اور اچھے کاغذ پر دارالکتب المصریہ نے اپنے ذاتی انداز میں چھاپی تھی مگر دوسری جلد میں ان باتوں کا چنداں خیال نہیں رکھا گیا۔

محققین کے پیش نظر پانچ مخطوطے تھے جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ سب سے قدیم نسخہ استنبول کے مکتبہ سلیمانہ میں ۶۶ نمبر پر موجود ہے۔ بہت ہی قدیم کوئی خط ہے اور چوتھی

صدی ہجری کا لکھا ہوا ہے۔ اس نسخہ کے بعض حصوں پر تمککات اور سماعت درج ہیں۔ ان سماعت میں سب سے قدیم سماعت ۳۸۱ھ میں علی بن الحسین بن محمد بن الحسن بن ابراہیم المعروف بابن الطهرانی کی ہے۔ اس نے ابو عبد اللہ محمد بن اسحق بن یحییٰ بن مندہ سے اس نے محمد بن یعقوب الامم نیشاپوری سے اور اس نے محمد بن الجہم السمری فراء کے شاگرد سے سنا ہے۔ کتاب بٹا چکی ہے۔ آخر میں ناقص ہے اور بعض مقامات پر کرم خوردہ بھی ہے۔ یہ نسخہ سوق الانسان پر ختم ہوتا ہے۔ اس نسخے میں ۲۲۲ ورق ہیں اور ایک صفحے پر ۲۴ سے ۲۸ تک سطریں ہیں۔ اس کا فوٹو سٹیٹ دارالکتب المصریہ میں نمبر ۲۴۹۸ ب میں موجود ہے۔

۲۔ دوسرا نسخہ بھی اتنبولہ کی کتب خانے نور عثمانیہ کا ہے۔ مکتبہ میں اس کا نمبر ۳۲ ہے۔ ایک جلد میں ہے ناقص الاول ہے۔ سورۃ الزمر سے شروع ہو کر قرآن کے آخر تک ہے۔ اس نسخہ پر کئی جگہ بھی تاریخ درج نہیں ہے۔ تقریباً چھٹی صدی ہجری کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ الفاظ کی صحت اور اعراب کی طرف خاص دھیان دیا گیا ہے۔ اس نسخہ میں چند اوراق پر کچھ حضرات کا بلاغ مرقوم ہے۔ ایک ہی جلد میں ۱۵۱ اوراق پر مشتمل ہے ایک صفحے میں ۱۸ سے ۲۴ تک سطریں موجود ہیں۔ اس نسخے کا فوٹو سٹیٹ بھی دارالکتب المصریہ میں نمبر ۲۴۹۸ ب پر موجود ہے۔

۳۔ تیسرا نسخہ بھی نور عثمانیہ ہی سے ہے۔ اس کا نمبر ۴۵۹ ہے۔ بہت ہی متاخر و رد کا لکھا گیا ہے۔ تقریباً بارہویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔ خط نسخ بہت عمدہ ہے۔ ایک ہی جلد میں ۱۸۹ اوراق پر مشتمل ہے۔ ایک صفحے پر تقریباً ۳۰ سطریں ہیں۔ اس کی تصویر بھی دارالکتب المصریہ میں نمبر ۲۴۷۷ ب پر موجود ہے۔

۴۔ ایک نسخہ علامہ محمود شنیطی کے کتب خانے میں بھی موجود ہے۔ یہ تو اسی صدی کے اوائل کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے ۲۲۲ اوراق ہیں اور ایک صفحے پر ۳۲ سے ۳۵ تک سطریں موجود ہیں۔ نسخہ کے ابتدا میں علامہ شنیطی نے اپنے ہاتھ سے وقف لکھا ہے۔ جلد ساز نے جلد باندھتے وقت اس کے اوراق آگے پیچھے لگا دیئے ہیں۔ یہ تبدیلی سوق الروم سے سورۃ احزاب تک ہے۔ باقی حصہ بالکل ٹھیک ہے۔ اس نسخہ دارالکتب المصریہ میں تفسیر کے نمبر ۱ پر موجود ہے۔

۵۔ ایک اور نسخہ بھی علامہ شنیطی مرحوم کے ہاں موجود تھا۔ وہ صفحہ سورۃ یس سے آخر قرآن تک ہے۔ اس پر علامہ کی تملیک کا سن ۱۳۱۰ھ درج ہے۔ انہی ایام کی کتابت بھی ہے۔ اس کے صرف ۱۵ اوراق ہیں نسخہ اس وقت دارالکتب المصریہ میں تفسیر کے نمبر ۱۱ پر محفوظ ہے۔

اس تفسیر کی اشاعت کے حلیل القدر کا اکا بیڑا ابتدا میں دارالکتب المصریہ نے اٹھایا تھا۔ دوسری جلد کی لمباعت کے بعد یہ وعدہ مہیوم نظر آنے لگا ہے۔ اس لئے کہ دوسری جلد ردی کاغذ پر خراب ٹائپ میں چھپی ہے۔ اس حالات ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ معافی القرآن کی تیسری جلد کب منصہ شہود پر آئے گی۔